نظریۂ حیات کی تشکیلِ نو

اسلم صدیقی[1]

پاکستان کی نجات، جیساکہ پچھلے باب میں بیان کیا گیا ہے، مخلوط دفاع کی تنظیم میں ہے۔ مخلوط دفاع سے عظیم سیاسی، معاشرتی اور دوسرے نتائج بھی مترتب ہوتے ہیں۔ یہ پوری کی پوری قوم کو یہ بتا کر کہ اس کے سامنے کیا مقصد ہے، جس کی کہ اسے لگن ہونی چاہیئے اور جس کے لئے اسے لڑنا چاہیئے، اس کو سراپا عمل بنا دیتا ہے۔ اس سے قناعت پرستی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مطمئن ہونے کی صورت حال ختم ہو جاتی ہے اور نئی قدریں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ واقعہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک ارتقائی عمل کے طور پر ہوتا ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بہت زیادہ احتیاط چاہیئے۔

فان کلوزوٹز (FON CLAUSWITZ) کا خیال ہے کہ عوامی جنگ "ایک طوائف الملوکی اور انارکی کی حالت ہوتی ہے جسے قانونی شکل دے دی جاتی ہے اور یہ اندرون ملک کے معاشرتی نظام کے لئے اتنی ہی خطرناک ہے جس قدر کہ ایک غیر ملکی دشمن۔" اس خیال کی تائید میں اسلامی تاریخ کے شروع کے دور کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ خوارج دینِ اسلام کے پانچ ارکان کے ساتھ جہاد کو اس کا چھٹا رکن مانتے تھے۔ اور اس بارے میں وہ اس انتہا کو پہنچ گئے کہ بہت معمولی سی بات پر مشتعل ہو کر وہ تلواریں نیاموں سے نکال لیتے تھے۔ چنانچہ جب تک ان کا وجود بحیثیت ایک جماعت کے رہا، انھوں نے "طوائف الملوکی اور انارکی کی حالت" برپا رکھی۔ وہ برابر بغاوتیں کرتے رہے اور ان کے کلی صفایا پر ہی یہ مصیبت ختم ہوئی۔

بالاتر وفاداریاں عوام کو بندوق چلانے کی تربیت دینے سے ڈاکہ زنی اور یہ کہ لوگ اپنی رائے کا اظہار بندوق کی گولی سے کریں، اس کے مواقع بہت بڑھ جاتے ہیں۔ البتہ اس سے عوام کا کھلم کھلا بغاوت کر دینا اس کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔ آج حکومتوں کے پاس ایسے تباہ کن اسلحہ ہیں کہ ان کی موجودگی میں صرف فوجی

---

[1] جناب اسلم صدیقی کی کتاب "A PATH FOR PAKISTAN" کے ایک باب کا ترجمہ۔ مترجم۔ محمد۔

طاقت کی بنیاد پر مسلّح بغاوتیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ایسے معاشرے میں زیادتیوں کا جمع ہوتے جانا بھی ٹھیک نہیں۔ ان کا ردّ عمل بہت سخت اور بہت جلد ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو روکنے کے لئے بالاتر ذمہ داریاں پیدا کرنا ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوط دفاع کے نظام کو بروئے کار لانے کے لئے بالاتر وفاداریوں کا وجود انتہائی ضروری ہے۔ ان کے بغیر ایک چھاپہ مار اپنا سب کچھ داؤ پر نہیں لگا دے گا۔ اور نہ لوگ طویل مصائب اور ظلم و ستم کو جو چھاپہ مار جنگ کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، برداشت کریں گے۔ بات یہ ہے کہ چھاپہ مار جنگ میں چھاپہ ماروں کو جو کامیابیاں ہوتی ہیں، ان کی سزا لوگوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔

چھاپہ مار جنگ میں بالاتر وفاداریوں کا ہونا ناگزیر ہے۔ ماؤزے تنگ نے کہا ہے کہ جب تک سامنے سیاسی مقصد نہ ہو، چھاپہ مار جنگ لازماً ناکام رہے گی اور وہ اس صورت میں بھی حتمی طور پر ناکام رہے گی، اگر اس کے مقاصد عوام کی آزادی سے ہم آہنگ نہ ہوں گے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ اس لحاظ سے پاکستان میں پوری ہم آہنگی ہے۔

تمام پاکستانیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کی زندگی قرآن اور سنت کے مطابق ہو[۲] لیکن اسے بامعنی بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ یہ آرزو آج کی دنیا میں ایک پالیسی اور پروگرام کی شکل اختیار کرے اور جب تک یہ نہیں ہوگا۔ اس آرزو کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ تعبیر اور تطبیق کے اس عمل میں حقیقت مطلق اور اس کی ایک تاریخی شکل میں جو فرق ہوتا ہے، اسے جاننا بہت اہم ہے۔ کیونکہ امت کی اکثر مصیبتیں زیادہ تر اسی فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہیں۔

ایک عظیم تفرقہ ۶۳۲ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کی زندگی میں سیاسیات کو بتدریج زیادہ اہمیت ہوتی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ کا بحیثیت خلیفہ کے انتخاب بالاتفاق نہ تھا۔ اور اس وقت تک مسلمانوں کے بعض گروہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ساتھ ہی نبوت کے بعض جھوٹے مدعی اٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کی وجہ سے کچھ عرصہ خلفشار رہا۔ اس کے ساتھ ہی ارتداد شروع ہو گیا۔ یہ معاملہ تمام تر سیاسی تھا۔ بعض قبائل کے لئے مدینہ کی اطاعت اور اس کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی قابل قبول نہ تھی۔ اور اس بناء پر انھوں نے علیحدہ ہو جانے کی دھمکی دی۔

---

[۲] سن زو (۵۰۰ ق-م) نے اپنی کتاب "THE ART OF WAR" میں مختلف فوجوں کی اضافی طاقت کو جانچنے کا معیار سات باتیں بنائی ہیں۔ جن میں سے سب سے پہلی اور سب سے مقدم بات اخلاق ہے۔

اس نازک صورت حال سے نمٹنے کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے بڑا مؤثر اقدام کیا۔ انھوں نے ان تمام مخالفتوں کو کچل دیا اور اس طرح ایسے خطرناک مرحلے پر اُمت کی وحدت قائم کردی۔ متذبذب قبائل تو اسلام کے دائرے میں لوٹ آئے اور دوسروں کو کافی نفسیاتی دھچکا لگا۔ غرض اُمت کو معاشرتی اور سیاسی استواری مل گئی۔ حضرت عمرؓ نے اسی پالیسی کو دوسرے محاذوں پر جاری رکھا۔ مختصراً حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں کوئی بھی سیاسی مسئلہ قابو سے باہر نہ ہوسکا۔

بعد ازاں قبائلی بنیادوں پر سیاسی جھگڑے شروع ہوگئے اور انھوں نے بنوہاشم اور بنوامیہ میں جو پہلے سے رقابت چلی آتی تھی، اسے ہوا دی۔ حضرت عثمانؓ نے آخر الذکر کا ساتھ دیا۔ ان کے بعض انتظامی فیصلے قریب قریب بغاوت پر منتج ہوئے جس میں حضرت عثمانؓ کو ۶۵۶ء میں شہید کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا اندوہ ناک سانحہ تھا، جس کے اثرات سے اب تک اُمت نکل نہیں سکی۔ اس سانحہ نے فوراً ہی اُمت کو دو متقابل گروہوں (شیعوں) میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ حضرت علیؓ کا حامی تھا اور دوسرا حضرت معاویہ کا۔ اس سے جو جھگڑے شروع ہوئے تو نوبت کھلم کھلا جنگوں تک پہنچی اور اس سلسلے میں دینیات کو بھی سیاسیات میں گھسیٹ لیا گیا۔ آخر میں حضرت معاویہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور جب وہ مسند خلافت پر پوری طرح جم گئے تو ان کا گروہ ان کے نام سے باقی نہ رہا۔

جہاں تک حضرت علیؓ کے حامی گروہ (شیعہ) کا تعلق ہے، اس میں ۶۵۷ء میں صفین کے میدان جنگ میں اختلاف رونما ہوا۔ ایک فریق نے جسے بعد میں خوارج کا نام دیا گیا، جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے حَکَم کی تجویز ماننے پر اعتراض کیا اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کا نعرہ یہ تھا "ان الحکم الا للّٰہ" اس نے اِس نیت سے اپنا ایک امیر عبداللہ بن وھب چُنا کہ وہ خود اپنی ایک مثالی اسلامی ریاست قائم کریں گے۔ ۶۵۸ء میں نہروان کے مقام پر حضرت علیؓ نے انھیں شکست فاش دی۔ غرض یہ خوارج جو بنوامیہ کے مذہباً مخالف تھے، اب خاندانِ حضرت علیؓ کے سیاسی لحاظ سے مخالف ہوگئے۔

ان خوارج میں سے ایک انتہا پسند فرقہ ازارقہ کا نکلا۔ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اور صرف وہ مسلمان ہیں اور جو "قاعدین" یعنی گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد نہیں کرتے، وہ گناہ گار ہیں۔ اس لئے اُن کو اور اُن کی بیویوں اور بچوں کو قتل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح جو لوگ برسرِ اقتدار تھے، انھیں بھی گناہ گار قرار دیا گیا اور اُن کے خلاف بغاوت کرنا جائز ٹھہرایا گیا۔ غرض یہ برابر بغاوت کرتے رہے۔ پانچ مرتبہ یہ حضرت علیؓ کے خلاف اٹھے اور بیس مرتبہ حضرت معاویہ کے خلاف۔ خوارج کی اس انتہا پسندی کی وجہ سے اُمت کو ان سے کوئی ہمدردی نہ رہی

اور اس طرح ان کی جڑیں ناپید ہوگئیں، آخر ۶۹۷ء میں حجاج نے انہیں کچل دیا۔

شیعہ | خارجیوں کے بالکل برعکس شیعہ حضرت علیؓ کی ذات کے وفادار تھے۔ ۶۵۸ء میں ان میں سے ایک فریق نے یہ قسم کھائی کہ "وہ ان کے دوست ہوں گے جنہیں حضرت علیؓ نے دوست بنایا اور اُن کے دشمن ہوں گے، جن کے حضرت علیؓ دشمن تھے"۔ بعد میں اس عقیدے کی اشاعت ہوئی کہ علیؓ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصی تھے، اس لئے ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ غاصب ہیں۔ حضرت علیؓ سے اُن کی اولاد کو ورثے میں امامت ملی اور ائمہ کے معصوم ہونے اور صرف انہیں دین کی تاویل کرنے کا حق دار ہونے کے عقیدہ نے ائمہ کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے۔ امام وقتی طور پر غائب بھی ہو سکتا ہے۔ غرض شیعوں نے امام کو ایک ایسی حیثیت دی، جس کا تقرر نص سے ہوتا ہے اور وہ اختیار کامل رکھتا ہے۔

فرد بمقابلہ جماعت | معاشرتی نقطۂ نظر سے خوارج اور شیعوں میں اہم فرق یہ ہے کہ جہاں اوّل الذکر نے جماعت کو پورا اختیار دیا۔ وہاں شیعوں نے امام کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ مانا۔ پہلا نقطہ نظر اس دعوے پر منتج ہوا کہ ایک کالا کلوٹا حبشی بھی خلیفہ بن سکتا تھا۔ اور دوسرے نقطہ نظر نے ایک فرد کو الہیاتی رنگ دے دیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد "امام" اور "مہدی" کے تصوّرات بڑے ہر دلعزیز ہو گئے۔ مہدی کے بارے میں یہ فرض کیا گیا کہ مناسب وقت پر اُس کا ظہور ہوگا اور وہ دنیا کو ظلم سے اور مذہب کو خرابیوں سے پاک کرے گا۔ اس عقیدے کا نفسیاتی اثر تباہ کن ہے۔ امام مہدی کے اس انتظار نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کے لئے ایک جواز مہیا کر دیا۔ "بطل پرستی کا مسلک ایک قوم کو بزدل بنا دیتا ہے"۔ ۳ے

فرد اور جماعت کے اپنی اپنی جگہ با اختیار ہونے کے حق میں ان متقابل دعووں کا ایک ہی سی شدت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے۔ ہم مذہب مسلمانوں کے کفر اور اسلام کے بارے میں فیصلہ کرنے میں جو نظریاتی خطرہ مضمر تھا، اسے جلد ہی محسوس کر لیا گیا، خود خارجیوں میں سے ایک فرقہ واقفییں کے نام سے نکلا، جو مسلمانوں کے کفر اور اسلام کے معاملے میں قطعی فیصلہ کو ملتوی رکھنے کے حق میں تھے، گو اس بحث میں ایک فریق سیاسی لحاظ سے ختم ہو گیا لیکن مسلمان فرد اور جماعت کے با اختیار ہونے کے اضافی دعووں میں کبھی کسی مصالحت تک نہ پہنچ سکے۔ مختلف صورتوں کی بنیاد پر اسلام سے ڈکٹیٹرشپ کی تائید میں بھی اسی قدر دلیلیں دی جا سکتی ہیں، جس قدر کہ ایک مثالی جمہوریت کے حق میں۔

۳ے برٹرینڈ رسل کی کتاب POWER صہ ۲۷۳

مرجئہ شیعہ اور خوارج کے ان معتقدات کے خلاف جلد ہی ردّ عمل شروع ہو گیا۔ ان ہر دو کا اپنی اپنی جگہ انتہا پسندانہ اور ناقابل مصالحت موقف تھا۔ ایک مناسب وقت پر ایک نیا فرقہ مرجئہ ظہور پذیر ہوا، جو براہ راست واقفیں سے متاثر تھا۔ انہوں نے ایک ایسا اندازِ فکر اختیار کر کے جو ایک حد تک فراریت پسندانہ اور ایک حد تک حکومت کے حق میں تھا۔ اسلام کے اصولوں اور اس وقت کے سیاسی حقائق کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کی۔ مرجئہ نے ایک مسلمان کے مومن ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اپنے فیصلے کو معرض التوا میں رکھا اور زیادہ زور امت پر دیا۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں کو مطعون کرنے سے انکار کر دیا اور اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔ وہ قانون کو شخصیات سے بالا رکھنے کے حق میں تھے۔ وہ افراد کو یہ حق دینے سے انکار کرتے تھے کہ یہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ جن لوگوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، وہ دوزخ میں جائیں گے یا بہشت میں۔ ان کا کہنا تھا کہ بے شک گناہ گاروں کو اپنے جرائم کی مقررشدہ سزا ملنی چاہیئے، لیکن وہ اُمت سے خارج نہیں کئے جا سکتے۔ سیاسیات میں انھوں نے غیر جانبداری اور بعض امور میں مقاومت مجہول کے مسلک کو اپنایا۔ انہوں نے اموی حکومت کو جائز حکومت قرار دیا اور اس طرح اس وقت امن عامہ کے نظام کی امداد کی۔

سنی مسلک سنی مسلک ترمیم شدہ مرجئیت کا براہ راست وارث ہے۔ وہ دو اصول جن پر سنی مسلک کی ابتداء اور اس کی شروع کی نشو و نما کا دار و مدار تھا، یہ تھے۔ ایک دونوں اطراف کی انتہاؤں میں ترکیب و امتزاج اور دوسرے ان دونوں میں توازن پیدا کرنا۔ اسے اس امر میں کوئی تامل نہ تھا کہ وہ کچھ چیزیں "دائیں" سے لے اور کچھ "بائیں" سے اور ان کو باہم سمو دے۔ بات یہ تھی کہ افلاطونی مثالیت سے لے کر بھونڈی طرح کی مادیت تک ہر قسم کے مذہبی اور سیاسی خیالات اسلامی معاشرے میں در انداز ہو رہے تھے۔ اس موقع پر سنی مسلک نے ان مختلف عناصر کو سمونے، ان میں ترمیم و تنسیخ کرنے اور بعض کو مسترد کرنے میں اپنی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ یقیناً یہ عمل معاشرتی ارتقاء پر مہر تصدیق ثبت کرنا تھا۔

جب تک مسلمانوں میں تخلیقی طور پر مختلف اجزاء کو ملا کر ایک وحدت بنانے اور انہیں ترکیب دینے کا جذبہ رہا، وہ حالات پر غالب رہے، وہ سیاسی لحاظ سے طاقت ور تھے، ذہنی اعتبار سے تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے اور اخلاقاً فعّال تھے، لیکن جب وہ جذبہ نہ رہا، نشو و نما رک گئی اور معاشرہ مجبوراً جامد ہو کر رہ گیا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد سنی مسلک جمود پذیر ہو گیا۔ سیاسی حقیقت پسندی، جس پر اُس کا شروع کا موقف مبنی تھا، بگڑ کر مصالحت جو ہوئی اور حقیقتاً عملی لحاظ سے ابن الوقتی اور زمانہ سازی بن گئی۔ خارجیوں کی بغاوت پسندی

کے ردّعمل کے طور پر سیاسی لحاظ سے جماعت کا ساتھ دینے کو قریب قریب ایک مثالی نصب العین کو حیثیت دی گئی۔ خوارج کا دعویٰ قرآن کی یہ آیت تھی: "ان الحکم الا للّٰہ" لیکن اسے 'طاقت ہی حق ہے'، کی کچھ شکل دے دی گئی۔ چنانچہ جو بھی عملاً برسراقتدار آجاتا، اسے ایک حد تک یہ سمجھ لیا جاتا کہ وہ خدا کا فرستادہ ہے[۵] سیاسی اخلاق میں اس ڈھیلے پن کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے کے اخلاقی اور روحانی معیاروں میں ایک عام تنزل آگیا۔ ذہنی ارتقاء آہستہ آہستہ رک گیا، اور اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس سے تدریجی ترکیب و امتزاج اور مطابقت پذیری کی روح سرد پڑ گئی۔ وہ فقہی، دینیاتی اور نظریاتی نظام جو شروع کی پانچ صدیوں میں ردّ و کد کے بعد ارتقاء پذیر ہوئے تھے، انہیں واجب التعمیل اور ناقابل تغیّر قرار دے دیا گیا اور ان کو مقدس مان لیا گیا۔ اس ضمن میں یہ بھلا دیا گیا کہ یہ نظام بالفعل ایک طرح سے ایک ارتقائی تاریخی عمل ہی کا نتیجہ تھے۔

اس وقت اسلام کی جو فکری عمارت ہے، اس کی اصل بنیاد یہ تین نقطہ ہائے نظر ہیں۔ جو خارجیت، شیعیت، اور سنیت کے تھے اور جو اگر تمام کے تمام نہیں، تو اغلباً سیاسی ہیں۔ اس سے حتمی طور پر چند نتائج مترتب ہوئے۔ وہ جماعت جو کھلم کھلا مخالف جماعت تھی یعنی خوارج، اُن کے لئے سوائے تلوار کے اظہار اختلاف کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے برسراقتدار حکومت کے لئے اُن کا استیصال کرنا لازمی ہو گیا۔ شیعہ شروع میں ایک روشن خیال حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے قائم شدہ حکومت کے خلاف تخریبی طریقے اختیار کر لئے اور اس طرح وہ بنو امیہ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن بنو امیہ کے بعد حکومت ان کے ہاتھ نہ آئی اور سُنی حزب اقتدار بن گئے۔ غرض اوپر کی یہ تینوں جماعتیں بحث و نظر اور اکثریت کے فیصلوں کو قبول کرنے کے بارے میں کوئی بھی طریقے ارتقائی طور پر تشکیل نہ کر سکیں۔

معتزلہ اس میں شک نہیں کہ سیاسیات نے ملّت کی اخوت کو پارہ پارہ کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود سیاسیات آزاد ذہن کو جسے اسلام نے فطرت کے اسرار معلوم کرنے کی ہمت دلائی تھی، روک نہ سکی۔ قرآن کی سب سے پہلی نازل شدہ آیات میں ہے: "اقرا وربك الاكرم الذی علّم بالقلم علم الانسان مالم یعلم (۹۶: ۳-۵) (پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں، جس کا اُس کو علم نہ تھا) اس لئے مسلمانوں نے شروع ہی میں اپنے ارد گرد نظریں دوڑانی شروع کر دیں اور جو وہ نہیں جانتے

---

[۵] امام الماوردی کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں امارة الاستیلاء" کا باب ملاحظہ ہو۔ امام الماوردی نے اس قسم کے استیلاء کو جائز ٹھہرایا ہے۔

تھے، اسے معلوم کرنا چاہا۔

معتزلہ اس روح کے بہترین ترجمان تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عقل اخلاقی قدروں کی مصدر و منبع ہے اور یہ کہ عقل اور وحی میں تناقض نہیں، کیونکہ دونوں کا خالق و مسبب ایک ہی خدا ہے۔ چنانچہ انسانوں کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ مانیں کہ یہ نیکی ہے، بلکہ وہ اسے عقلاً جان بھی سکتے ہیں۔ معتزلہ انسانی رائے کی آزادی کے لئے اس موقف کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ کائنات کے بامقصد ہونے نیز اس اصول پر کہ "اللہ کو وہی کرنا چاہیئے، جو مفید ہو" یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے مذہب کا خالصاً عقلی اور فلسفیانہ بنیادوں پر مطالعہ کیا تاکہ وہ عمومی اصولوں پر سر مخالفت کا مقابلہ کر سکیں۔ معتزلہ کا اس پر اصرار تھا کہ حق کی تلاش میں فکری آزادی لازمی ہے۔ وہ صرف قرآن کو دین کی اساس مانتے تھے اور انہوں نے توحید اور عدل خداوندی کو خاص اہمیت دی۔

اسلام کے دفاع اور اس کی نشر و اشاعت میں معتزلہ کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ "بحیثیت مفکرین اور معلّمین کے ایک گروہ کے، انھوں نے اُن ممالک کے لوگوں میں جنہیں عربوں نے فتح کیا تھا، اسلام پھیلانے کے سلسلے میں بے بہا خدمات انجام دیں۔ مدینہ کی تقویٰ و نیکی کی زندگی کے سادا مذہبی معتقدات اور یونانی ثقافت اور مغربی ایشیا کی لاادریت کی طویل تاریخی روایات کے درمیان ایک خلیج حائل تھی، جسے پار کرنا بہت مشکل تھا۔ یہی وہ خلیج تھی، جو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں بڑے عجیب و غریب ملحدانہ تحریکوں کے ظہور پذیر ہونے کا (خاص طور سے عراق میں) باعث بنی۔ اور اسی خلیج کو معتزلہ میں سے جو متقدمین تھے، انھوں نے بھرا۔"[5]

آیا قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق، اس بحث نے ایک ایسی شکل اختیار کی جو معتزلہ کی تباہی کا سبب بنی۔ اس کے ساتھ اُن کا دینی و ادبی سرمایہ بھی تباہ ہو گیا۔ جو آج دنیائے اسلام کے انتشار اور شکست خوردگی کی موجودہ حالت میں بہت مفید ثابت ہوتا۔ معتزلہ کے ساتھ ہی اسلام میں عقلیت کی روایت بھی ناپید ہو گئی، سوائے اکّا دکّا فلسفیوں، جنہوں نے اسے کسی نہ کسی حد تک جاری رکھا۔

<u>عقلیت کے خلاف بغاوت</u> معتزلہ کے بعد یہ بحث کہ اخلاقی قدروں (برّ و اثم) کا مصدر و منبع اصلاً عقل ہے یا وحی، بے جان اور حقیقت سے الگ تھلگ خالی خولی شکل میں جاری رہی۔ عقلیت کو واضح اور یقینی الفاظ میں مطعون کیا جاتا رہا۔ امام ابن تیمیہ کی کتاب الردّ علی المنطقیین اور سید جمال الدین افغانی

---

[5] سر ہملٹن گب (MOHAMMADANISM) صفحہ ۸۸

کی تصنیف الردّ علی الدھریین اسی ذہنی کیفیت کی آئینہ دار ہیں اور یہ کہ عقل سے کوئی چیز ثابت نہیں ہو سکتی، منطق میں اصلاح کی ضرورت ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ مادیت (ڈارون کا نظریہ ارتقا) جس کے خلاف سیّد جمال الدین افغانی نے لکھا ہے، حیاتیات کے مدار سے آگے نکل گئی ہے اور اس نے پورے انسانی فکر کو بڑے زوروں سے متاثر کیا ہے۔ القصہ انسانی فکر کو جامد اور اپنی غلطیوں سے فائدہ اٹھانے کے نااہل سمجھ لیا گیا۔ جلد علم تنزل پذیر ہو کر بہت جلد ذہنی قید خانہ بن جاتا ہے۔

مثبت علم عقلیت کے ساتھ ساتھ مثبت علم بھی مشکوک قرار دیا گیا۔ شیخ مجدد الف ثانی ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جیومیٹری کا مطالعہ تضیع وقت ہے۔ آخر اس کے جاننے سے کیا فائدہ کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو زاویے قائمہ بنتے ہیں۔"[۵] یہ غالباً افلاطون کے اس قول کی تردید میں کہا گیا تھا، جس میں اس نے کہا ہے کہ "خدا ہر وقت جیومیٹری کے سوالات کرتا رہتا ہے۔" اسے آپ بمشکل ہی صحت مند دماغی حالت کہیں گے۔ یہ تو اللہ کی اس حکمت کے انکشاف کرنے کا انکار ہے، جس کے تحت اس دنیا میں تمام کام ہو رہے۔

مثبت علم کے بارے میں یہ نقطۂ نظر کسی اعتبار سے بھی مفید نہیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں انسان کو فطرت میں غور کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: الم تر ان اللہ یولج اللیل فی النھار و یولج النھار فی اللیل وسخر الشمس و القمر کل یجری الی اجل مسمی (۳۱-۲۹)۔ (کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور ہر ایک وقت مقررہ پر چلتا ہے۔) سائنسی فکر اور مثبت علم صرف یونانیوں یا مغرب ہی کی جاگیر نہیں۔ ہر سوچنے والا ذہن اور سب سے زیادہ مسلمان اس میں حصہ دار ہیں۔ قرآن بار بار اس امر کی تاکید کرتا ہے کہ مسلمان عقل سے کام لیں اور فطرت میں غور و خوض کریں۔

مسلمانوں میں ابن خلدون نے تاریخ نگاری میں سائنسی طریقۂ فکر کو اپنانے کی کوشش کی، لیکن بدقسمتی سے اس کے بعد آنے والے اس کے طرز فکر پر نہ چلے۔ اور ابن خلدون کے تخلیقی فکر کا بیج بنجر زمین میں گرا اور وہ نہ اُگا۔ علامہ اقبال نے پھر اسی سمت کی نشان دہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دینیاتی نظام کے تصوّرات جو عملاً مردہ مابعد الطبیعات کی اصطلاحات میں ملبوس ہیں، ان لوگوں کے لیے چنداں سود مند نہیں، جن کا عقلی پس منظر کچھ مختلف ہے۔ آج جدید مسلمان کے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ اسے

---

[۵] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اوّل مکتوب ۲۶۶

ماضی سے اپنا رشتہ پوری طرح منقطع کئے بغیر اسلام کے پورے نظام پر نئے سرے سے غور وفکر کرنا ہے۔ اس بارے میں ہمارے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم جدید علم کے متعلق با احترام لیکن آزادانہ رویّہ اختیار کریں اور اس علم کی روشنی میں تعلیمات اسلام کو سمجھیں، خواہ اس میں ہمیں اپنے اسلاف سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے" [ے]

ہمارے اکثر پیشروؤں نے قدیم متون کتب کو بتوں کی طرح پوجا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس بت پرستی کو ختم کیا جائے اور اپنے ارد گرد واقعات و حادثات کی دنیا میں اللہ کی نشانیوں کو ڈھونڈا جائے۔ اس سے خود ہمیں قدیم متون کتب کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

خلاء کو پُر کرنے کی ضرورت عقلیت اور مثبت علم کی تردید و مخالفت سے یوں جو خلاء پیدا ہوا، مسلم دینیات نے اسے پُر کرنے کی بڑی سخت کوشش کی۔ اس میں الفاظ، غلط سلط تاریخ اور حدیث بہت کام آئی۔ سیاسی قسمت آزما تو ہر پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تائید میں خوب جھوٹی روایتیں گھڑیں اور چونکہ دماغوں پر پہلے ہی سے سوچ بچار کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے، اس لئے ان میں انتشار پھیلا۔ اور ساری کوششیں بس الفاظ اور کتابوں کی بحث و تنقید پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کی وجہ سے لغت کے مطالعہ، متون کی شروح اور اسناد احادیث کی صحت کو جانچنے اور اس طرح کے علوم کو بڑا فروغ ملا۔ اور کسی نے ان کی تہ تک جانے کی کوشش کی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی بھی عمومی اصول منکشف نہ کر سکے اور اس طرح انھوں نے مجموعی انسانی علم میں کوئی اضافہ نہ کیا۔

اس کا نتیجہ بڑا ہی افسوسناک نکلا۔ جس چیز کو بھی راسخ العقیدگی کے خلاف پایا گیا، وہ ختم کر دی گئی۔ پہلے گزرے ہوئے کسی عالم کے حوالے کے بغیر کوئی بات کہی نہیں جا سکتی تھی۔ مخصوص مفادات اور نقطہ ہائے نظر کو آگے بڑھانے کے لئے کتابیں تصنیف کی گئیں، اور انہیں مشہور شخصیات کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ بعض لوگوں نے غیر راسخ العقیدہ باتیں کہنے کے لئے خوابوں کو سہارا بنایا۔ بعد کی صدیوں میں کئی ایک بہترین مسلمان مصنفین نے اپنے خیالات کی تائید کے لئے موضوع احادیث و تاریخ کو ذریعہ بنایا۔ اس سے پورے ادبی و علمی سرمائے کو نقصان پہنچا۔ اب اس کا ایک بڑا حصہ محض مناظرانہ اور جانب دارانہ ہے۔ بعد کے مسلم ادب میں مشکل ہی سے کہیں معانی اور ہیئت میں کسی نئے تجربے کا سراغ ملے گا۔ غرض اس طرح تخلیقی اور معروضی طرز فکر بالکل ناپید ہو گیا۔

تصوّف۔ علامات و رموز کی دنیا معاشرتی زندگی میں جبریت اور انسانی فکر و عمل کی آزادی کے انکار کا عقیدہ روز بروز سخت تر ہوتا گیا۔ بعد ازاں متصوفانہ خیال آرائی نے اسی متشدد جبریت پر اپنے وحدت الوجود اور ہمہ اوست

ے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ از علامہ اقبال

کے عقیدے کی عمارت کھڑی کی۔ اس نظریے سے کہ "تمام افعال کا خالق اللہ ہے۔" صوفیہ اس پر پہنچے کہ "تمام افعال اللہ ہی کے افعال ہیں۔" آگے چل کر وحدت الوجود کے نظریے نے لاموجود الا اللہ، کی شکل اختیار کر لی۔ اس مقام پر نہ صرف انسانی آزادی ناپید ہو گئی، بلکہ نیکی اور بدی میں ہر قسم کے امتیازی فرق کو ہی قریب قریب ختم کر دیا گیا اور اس طرح وہ اخلاقی حِس کمزور پڑ گئی، جو ایک زندہ اور متحرک معاشرے میں روح رواں ہوتی ہے۔

اسلامی معاشرے پر تصوف کے اثرات کا احصاء کرتے ہوئے سرہملٹن گب لکھتے ہیں:- "سب سے پہلے جیسے جیسے متصوفانہ خیال آرائی نے زیادہ سے زیادہ راسخ العقیدہ عقائد کے استدلال کے نسبتاً معروضی طرز تنقید اور یونانی سائنس کی جگہ لینا شروع کی، عقلی معیار روبزوال ہوئے۔ اس کے بعد گو اخلاقی معیار مجموعی طور پر برقرار رہے۔ لیکن تقدس کے ثبوت کے سلسلے میں جادو اور کرامات کے متعلق جو عام خوش عقیدگی پھیلی، تو اس نے ان اخلاقی معیاروں کے بارے میں بھی ایک حد تک ذہنی انتشار پیدا کر دیا۔ اسلام نے اپنے دور اوّل میں جہاں روحانی عوامل کے بااثر و غالب ہونے پر زور دیا، وہاں اس نے بطور اپنے ذرائع کے مادی عناصر کو بھی تسلیم کیا تھا۔ اب جو مقبول عام اسلام تھا، اس نے مادی قدروں کو حقیقت واقعی سے عاری قرار دے کر سرے سے مسترد کر دیا۔ مسلمان ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جو علامات کی دنیا تھی، جہاں جو کچھ نظر آتا تھا، وہ نہ تھا، جو اصل میں تھا اور الفاظ کے معنی وہ نہ تھے، جو اُن سے ظاہر ہوتے تھے، بلکہ کچھ اور تھے۔ چنانچہ جب ملت اسلامی کو نئے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ ان کو سمجھنے اور اُن سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہی۔ وہ ہر معاملے میں قطعیت میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہونے کا مطالبہ کرتی تھی اور وہ اس کے لئے تیار نہ تھی کہ مادی واقعیت کے پیش نظر اپنے مثالی مقاصد میں کسی قسم کی مفاہمت کرے" [۸]

بے حرکت تشکار | اس منفیانہ رویّے کے بڑے المناک نتیجے نکلے۔ اُمّت نے سیاسی اداروں میں شرکت کرنے سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس طرح اس کے اندر منظم سیاسی جدوجہد سے ہچکچاہٹ پیدا ہو گئی [۹] اس سیاست بیزاری سے مطلق العنان اقتدار کو خوب کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور اس نے سیاسی اداروں کی شکل اختیار کر لی۔ ملت اسلامی کو اس کا خمیازہ انیسویں اور بیسویں صدی میں بھگتنا پڑا جب وہ ایک بے حرکت

---

[۸] Proceedings of the American philosophical society. جلد ۱۰۷ نمبر ۲ ص۱۷۵

[۹] فارسی کے مشہور شاعر حافظ کا ایک شعر ہے:

رموز مملکت خویش خسرواں دانند گدائے گوشہ نشین است حافظا مخروش

شکار کی طرح ان پالیسیوں اور فلسفوں کے حوالے کر دی گئی جو اس کے حکمراں طبقوں نے یورپ سے اخذ کئے تھے۔" ۵ے

اشعریت | ہم یہاں پھر تاریخی ارتقاء کے سلسلے کو شروع کرتے ہیں۔ عقلیت کے خلاف جو ردّ عمل ہوا، اس کی قیادت امام اشعری (۸۷۵ء - ۹۳۶ء) نے کی۔ اور اسے امام غزالی (۱۰۵۸ء - ۱۱۱۱ء) نے تکمیل کو پہنچایا۔ امام اشعری پہلے معتزلی تھے۔ بعد میں وہ شافعی المذہب بنے۔ انھوں نے بڑی سختی سے معتزلی مسلک کی مخالفت کی اور اپنے آپ کو اسلام کو عقلی رنگ دینے اور اس کے "دفاع" کے لئے سرتاپا وقف کر دیا۔ اس طرح انھوں نے علم الکلام کی بنیاد رکھی، اور وہ دینی وحدت کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ امام اشعری کے نظریۂ "بلاکیف" نے آزادی فکر اور بحث و تحقیق کے راستے کو بند کر دیا۔ اس سے ایک خاص طرح کا ذہنی انداز وجود میں آیا۔

اس میں شک نہیں کہ امام اشعری نے اسلام کو کچھ مدّت کے لئے آزادی فکر کے اُن رجحانات سے جو اُمّت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے درپے تھے، بچا لیا۔ لیکن بعد کے زمانے میں اس کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہوا۔ درحقیقت امام اشعری نے بحث و مباحثہ کے طریقے ہی کو ختم کر دیا۔

معاشرتی تضادات | ہر زندہ معاشرے میں اختلافات کا ابھرنا لازمی ہے اور اگر ان کو حل نہ کیا جائے تو یہ معاشرے میں تضادات کے باعث بنتے ہیں۔ ان تضادات کو مابعد الطبیعاتی اساس دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ انہیں منجمد کر کے کم و بیش مذہبی عقیدوں کی شکل دے دیں۔ جب تک کہ بالاتر وفاداری کا رشتہ مضبوط رہے، یہ تضادات ایک حد کے اندر رہتے ہیں، ورنہ یہ مخالفتوں کی صورت اختیار کر کے ملّت کے شیرازہ کو منتشر کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پیش نظر مسائل کے متعلق بحث و تنقید کو مابعد الطبیعاتی بلندی سے عقلی سطح پر لانا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے ایک مشترکہ بنیاد فراہم ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ مخالفتیں تضادات میں تبدیل ہو جائیں جنہیں کہ آخر میں طے کر لیا جائے۔ شائد یہ کہنا زیادہ غیر صحیح نہ ہو کہ تاتاریوں کے حملے کے وقت شیعوں نے جو معاندانہ رویّہ اختیار کیا، تو وہ نتیجہ تھا اشعریوں کے اس آفت انگیز طریقے کا، جس پر وہ خود مسلمانوں کے باہمی اختلافات یا تضادات سے نمٹنے کے سلسلے میں عامل تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ بحث و مباحثہ کو ایسے اختلافات دور کرنے کا موقع دیتے، وہ اندر ہی اندر ان اختلافات کو نمو پا کر ایسی مخالفتوں میں بدلنے کا سامان مہیا کرتے، جنہوں نے کہ حتمی طور پر آگے چل کر ملّت کو پارہ پارہ کر دیا۔

امام اشعری کی تقلید میں امام الحرمین الجوینی نے سوالات تک کرنے سے روک دیا، اور نصیحت کی کہ "بوڑھی

عورتوں کی طرح اپنے عقیدے پر جمے رہو" اس طرح سوچ سمجھ کر اسلام پر عقیدہ رکھنا ممکن ہو گیا۔ امام الحرمین کے شاگرد امام غزالی نے ان کی اس نصیحت کو عقلی رنگ دیا۔ انھوں نے اشعری مذہب کی آخری و قطعی شکل معین کی اور اسے اسلام کے عالمی مسلک کی حیثیت سے مستحکم کیا۔ امام غزالی نے فلسفیوں اور مذہبی تشدد اور کٹرپن رکھنے والوں ہر دو کی سخت مخالفت کی۔ آخر میں وہ اپنے متصوفانہ اور تجربی علم کے رجحانات کو باضابطہ قسم کی راسخ العقیدگی سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ امام غزالی نے اس سے منع کیا کہ لوگ عام طور پر مذہبی بحثوں میں حصہ لیں۔ اُن کی ایک کتاب کا نام ہے "الجام العوام عن علم الکلام" یعنی عوام کو علم الکلام سے روکنا [10]۔ انھوں نے فلسفہ پر تباہ کن حملے کئے، اور اسے ایک شئے ممنوع بنا دیا۔ امام غزالی نے ابن سینا اور الفارابی کی سخت مخالفت کی۔ ۱۱۵۰ء میں ابن سینا کی کتابیں بر سر عام جلائی گئیں۔

انسان یا فرشتہ یہ پورے کا پورا رویہ یہ فرض کرتا ہے کہ دانائی خود خدا سے بھی بڑی ہے۔ تخلیق آدم کے موقع پر فرشتوں نے بعض خدشات کا اظہار کیا تھا، جو اُس وقت بھی (اور آج بھی) صحیح ہیں۔ بے شک انسان "فساد کرتا اور خون بہاتا ہے۔" انسان نے خدا کی نافرمانی بھی کی اور ابلیس کو موقع دیا کہ وہ اسے خدا کے راستے سے بہکائے۔ لیکن خدا نے اسے معاف کر دیا۔ بعد میں اسے زمین پر بھیجا، اور اس کی رہنمائی کی۔ اس تمثیل میں نکتہ یہ ہے کہ انسان کو قوت فیصلہ اور غلطی کرنے کی استعداد عطا کی گئی ہے۔ فی الحقیقت اسی طریق عمل کے ذریعہ وہ باطنی گہرائی و وسعت حاصل کرتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو اٹھائے، جسے اٹھانے سے پہاڑوں تک نے انکار کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا رویہ انسانوں کو فرشتوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اس طرح انسانوں کی تخلیق سے اللہ کا جو مقصد تھا، اس کے خلاف جاتا ہے۔ انسانی شخصیت اپنی قوتِ فیصلہ استعمال کر کے اور غلطیاں کر کے ہی ترقی کرتی اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ اسی طریق عمل کی بدولت وہ "احسن تقویم" کے خطاب کا حق دار بنتا ہے۔

بغداد کی تباہی امام غزالی کی پُرزور تائید کے بعد اشعری مسلک مستحکم ہو ہی پایا تھا کہ جلد ہی اسلامی دنیا منگولوں اور صلیبیوں کے دو چکی کے پاٹوں کے درمیان آگئی۔ قرآن نے بار بار صراحت کی ہے کہ قوموں کا اپنے مجموعی اعمال کی بناء پر احتساب ہوتا ہے اور انہیں اسی دنیا میں اپنی بدکرداریوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:۔

---

[10] الجام العوام عن علم الکلام، قاہرہ ۱۹۱۲ء

"ولمن خلقنا امة یھدون بالحق وبہ یعدلون والذین کذبوا بآیتنا سنستدرجھم من حیث لا یعلمون و املی لھم ان کیدی متین" (۷ : ۱۸۱ - ۱۸۳)

(اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا، اُن میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کی راہ دکھاتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل بھی کرتے ہیں اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، ہم ان کو بتدریج لئے جارہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور ان کو میں مہلت دیتا ہوں۔ بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے)

بغداد تاتاریوں کے ہاتھوں ۱۲۵۸ء میں تباہ و برباد ہوا۔ یہ دراصل مسلمانوں کے خلاف بحیثیت ایک امّت کے خدا تعالیٰ کا فیصلہ تھا۔

مسلمان ان صدمات سے پوری طرح کبھی بھی سنبھل نہیں سکے۔ ان کے جو نفسیاتی نتائج انفرادیت اور احساس غیر ذمّہ داری کی شکل میں نکلے، وہ تصوف کے طریقوں کے ظہور کا باعث بنے۔ ہوسکتا ہے کہ ان سے ایک خاص قسم کی مذہبی جستجو کی تسکین ہوگئی ہو لیکن ان کا اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا پر جو زور تھا، اس نے ملت کی اجتماعی زندگی کو بے حد و حساب نقصان پہنچایا۔

ملّی اور انفرادی وفاداریاں تمام مذاہب اور معاشرتی تنظیموں کو ملّی اور انفرادی وفاداریوں کے درمیان ایک توازن قائم کرنا ہوتا ہے۔ افراد اور ملّت ایک دوسرے کی مدد کرتے اور اس سے تقویت حاصل کرتے ہیں۔ اگر ملّت انحطاط پذیر ہوتی ہے تو افراد مضبوط نہیں رہ سکتے۔ مسلمانوں نے ملّی مفادات کو نظر انداز کیا اور اس طرح وہ مکمل طور پر ارشاد باری کے مطابق اس کے "کیدی متین" کے مستحق ٹھہرے۔ اسلام کی مذہبی لحاظ سے بنیادی اور مخصوص تعلیم کا ایک معاشرتی و اخلاقی رخ ہے۔ جیسا کہ قرآن کی شروع کی آیات میں بتایا گیا ہے کہ توحید وہ بنیاد مہیا کرتی ہے جس پر اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی عدل اور مساوات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ اسلام کے شعائر جیسے کہ حج فرض نماز اور روزے وغیرہ ہیں کا واضح طور پر ایک معاشرتی رجحان ہے۔ زکوٰۃ کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی کی کمائی جائداد اور دولت اس وقت تک ناپاک ہے۔ جب تک کہ اس کا ایک حصّہ معاشرتی بہبود کے لئے الگ نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ملّی زندگی کے لئے ایک صحت مند، خوش حال اور ترقی خواہ معاشرتی نظام لابد ہے۔

مکافاتِ عمل تاتاریوں نے اسلام کی سیاسی تنظیم کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ بغداد کی تباہی کے ساتھ خلافت ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کا یہ احساس بھی کہ ہم ایک عظیم اُمت سے تعلق رکھتے ہیں، جاتا رہا۔ ملّی وفاداری کی جگہ انفرادی وفاداری نے لے لی اور معاشرتی نظام رُو بزوال ہونے لگا۔ ایک عام جمود کا رویّہ

اپنا لیا گیا۔ آہستہ آہستہ وہ اسلامی ادارے جن سے ملّی وفاداریاں وابستہ تھیں، انتشار کی نذر ہو گئے۔ شہنشاہیت سارے کے سارے اقتدار کی مالک بن گئی۔ سلطان "ظل اللہ" قرار دیئے گئے۔ کوئی بھی ایسا ادارہ نہ رہا جو فرد کو اس مرکزی طاقت سے جو بد کردار ہو گئی تھی، بچا سکے۔ لوگوں کی اس ذلت و پستی کے لئے بھی عقلی جواز ڈھونڈھ لیا گیا۔ "ایک خان، ایک خدا۔ جیسے خان کا فرمان ناقابل تغیر ہے، اسی طرح خدا کا حکم بھی۔ کیا کوئی عقیدہ اس سے بڑھ کر منطقی یا اس سے زیادہ ناقابل مزاحمت ہو سکتا تھا جب کہ دس لاکھ تلواریں بھی اس کی حمایت میں ہوتی تھیں؟ بربریت کا یہ سیلاب، عقلیت، فلسفہ، سائنس اور فنون کو اس طرح بہا کر لے گیا کہ پھر یہ کبھی نہ سر نکال سکے [11]

عقلی دیوالیا پن | تاتاریوں کی تباہ کاریوں کے بعد مسلمان مجبور ہو گئے کہ وہ امّت کو متحد رکھنے کی خاطر اشعری مسلک کے خول کا اتباع کریں اور ہر قسم کے تنقیدی تجزیے سے بچیں، یا شاید یہ ہوا کہ ان میں تنقیدی تجزیے کی صلاحیت ہی نہ رہی اور انھوں نے غلطی سے خول ہی کو اصل جوہر سمجھ لیا۔ ان کے ہاں تخلیقی غور و فکر ختم ہو گیا۔ اسی بناء پر بعض مستشرقین امام اشعری اور امام غزالی کو اسلام کے زوال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ای۔ جی۔ براؤن لکھتے ہیں:۔ "اسلام کی وہ تنزل پذیر تحریک، جس کا آغاز کار اشعری کی کامیابی سے ہوا، تیرھویں صدی کے وسط میں وحشی تاتاریوں کے ہاتھوں خلافت کے خاتمے اور بغداد کی تباہی سے اور بھی تیز اور مضبوط ہو گئی۔ ایک طرف چنگیز اور ہلاکو اور دوسری طرف اشعری تھے، جنہوں نے شروع کے عباسی خلفاء کے سنہری دور کی مادی اور عقلی عظمتوں کی بربادی میں اتنا ہی حصہ لیا، جتنا شاید کسی اور فرد نے لیا ہو گا" [12]۔ ایڈورڈ ساچو کی رائے ہے۔ "اشعری مسلک نے آزادانہ تحقیق کی قسمت کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا۔ اگر اشعری اور غزالی نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ عربوں کے ہاں گلیلیو، کیپلر اور نیوٹن پیدا ہوئے ہوتے" [13] بے شک یہ رائیں کافی سخت ہیں، لیکن بارھویں صدی کی ابتداء میں واقعی کچھ غلطیاں ہوئیں۔ مسلمان تخلیق کی اس روشنی سے محروم ہو گئے، جسے وہ اپنی جہالت کے موجودہ اندھیرے میں پہچاننے اور اسے دوبارہ حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔

ملّت نے کیا کھویا؟ | بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب رہے گا کہ بغداد کی تباہی تک مسلمان جو کچھ کھو چکے تھے، اس کا جائزہ لیا جائے۔ اوّلاً خارجیوں کا استیصال ہوا، اور ان کے ساتھ ان کا کچھ کر گزرنے کا آتشیں

---

[11] سید امیر علی Spirit of Islam صفحہ ۴۵۰۔

[12] Literary History of Persia جلد اوّل صفحہ ۲۸۶

[13] Translation of al-Biruni's chronology. مقدمہ صفحہ ۱

جذبہ اور ملّت کو افضلیت دینے کا عقیدہ ختم ہوگیا۔ بعد ازاں جہاد میں نرمی پیدا کردی گئی اور انسان کا مجبورِ محض ہونا مقدم ترین عقیدہ قرار دیا گیا۔ ثانیاً معتزلہ نیست و نابود ہوگئے اور اُن کے ساتھ مذہبی امور میں عقلیت اور فکر اور ارادے کی آزادی ناپید ہوگئی۔ غور و فکر میں جراءت و ہمت کی جگہ نامعلوم چیزوں پر کامل یقین کی بزدلی نے لے لی۔ مثبت علم مشکوک بلکہ قریب قریب شجرِ ممنوع قرار پایا۔ ثالثاً خلافت کا ادارہ نہ رہا اور اس کے ساتھ معاشرتی ذمہ داری اور ایک عالمی برادری سے متعلق ہونے کا احساس ختم ہوگیا۔ رابعاً صوفیہ نے ترکِ دنیا کے خیالات کو عام کیا، جس سے ایک ایسا نظامِ اخلاق بروئے کار آیا کہ اُس نے ملّت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔ "الدنیا جیفۃ وطلابہا کلاب" یعنی دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے، مان لیا گیا اور یہ اسلام کی روح کے بالکل منافی ہے۔ اسلام تو یہ کہتا ہے:۔ "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ" (۲ : ۲۰۱) (اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی اچھائی عطا کر اور آخرت میں بھی اچھائی عطا کر)

کیا کوئی ایسی قوم جو عمل سے گریز کرتی اور پورے طور پر عقیدۂ جبریت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔ جو غور و فکر کرنے کی ہمت نہیں رکھتی، اندھا دھند مان لینے کو ترجیح دیتی ہے اور ملّی بہتری پر انفرادی مفاد کو مقدم رکھتی ہے، کبھی فروغ پا سکتی ہے۔ بسلمانوں کو ایسے عقائد کے ساتھ یہ توقع رکھنے کا کیا حق ہے کہ وہ کامیاب ہو سکتے یا عزت حاصل کر سکتے ہیں۔

(باقی)